شاعری جزویست از پیغمبری

غالب سے فراز تک

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالب سے فراز تک

شاعری جزویست از پیغمبری

غالب
سے
فراز
تک

دستک پبلیکیشنز لاہور

سرپرست اعلیٰ — سید اسرار شاہ

کتابت — محمد اقبال بھٹہ

تدوین — سید ناظم حسنین، احمد فواد، بابر ہاشمی
نوید بٹ، طاہر لطیف

ناشر — سید محمد اویس

مطبع — بزنس پرنٹنگ سروس۔ لاہور

قیمت — ۳۶ روپے

مرتبین:
ندیم خان
بختاور بلال

فہرست

پیش لفظ

انسان جب احساس کی مشعل روشن کئے تخلیقی ارینوں میں اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہوتا ہے تو ادب جنم لیتا ہے اور جب آدمی ان روشن مشعلوں میں سچّے آدرشوں کا ایندھن جلاتا ہے تو آدمیت شعریت کا آہنگ پہن لیتی ہے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک واحد آئینہ ہے جس میں بہت سے اہلِ دانش کا عکس تعمیرِ انسانی کا پتہ دیتا ہے بامقصد شاعری اور ادب ہی درحقیقت تاریخِ آدم میں ایسے فکر آمیز تیشے ہیں جن کی بدولت ہر عہد میں جہانِ تازہ کی صورت گری ممکن ہوسکی۔ صدیوں سے اہلِ علم نے پرورشِ لوح و قلم کی ٹھان رکھی ہے چنانچہ یہ رسمِ آشفتہ سری ہنوز جاری وساری ہے۔ اور قارئینِ ادب چشمۂ صدّق سے مسلسل فیضیاب ہوئے جاتے ہیں۔

اردو ادب نے ایسے بے شمار صاحبِ فکر و عمل پیدا کئے ہیں جن کی تابناکیوں نے نہ صرف اعلیٰ و ارفع ادب تخلیق کیا بلکہ اپنے مقلدین کو شعر و سخن کے جدید اور مقصدیت سے لبریز زاویوں سے بھی روشناس کرایا۔ غالبؔ، حسرتؔ حالیؔ، اقبالؔ، فیضؔ، جوشؔ، ساحرؔ، مخدومؔ، مجازؔ، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور احمد فرازؔ کا شمار انہی ہوشمندوں میں ہوتا ہے جنہوں نے انسان کو بیدار کرنے اور اُسے جبر و استحصال کے آہنی شکنجے سے نجات دلانے کے لئے اپنے قلم میں خونِ دل کی کشید شامل کرنے سے کبھی بھی احتراز نہیں کیا بلکہ اپنے لہو کی بُوند بُوند سے صدائے اناالحق کے تابندہ و پائندہ شجر کی آبیاری کی۔ گویا انہوں نے مصطفٰے زیدی کے اس تاکیدی فرمان کی ہر آن تعظیم کی کہ

تمہیں نہ صرف شبستاں میں جا کے لکھنا ہے
ہر ایک عہد کے زنداں میں جا کے لکھنا ہے

زیرِ نظر مجموعۂ انتخاب میں ایسے شعراء حضرات کا منتخب کلام شامل کرنے کی جسارت کی گئی ہے جنہیں بجا طور پر اردو ادب کی آبرو قرار دیا جا سکتا ہے "غالب سے فراز تک" یوں تو لاتعداد ایسے شعراء موجود ہیں جنہیں حقیقی معنوں میں کسی منتخب مجموعۂ کلام میں شامل کرنے کے لئے بجائے خود ایک دفتر درکار ہے تاہم اس کتاب میں قریباً تمام مکتبۂ فکر سے وابستہ حضرات کی ترجمانی کی گئی ہے ممکن ہے کوئی شاعر آپ کو بے حد پسند ہو اور ہم انہیں جگہ نہ دے سکے ہوں لہٰذا ہماری اس مجبوری کو چشم اختصار سے یا پھر وسائل کی کم مائیگی کے ترازو میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

محمد اکرم خان
ایڈووکیٹ
ہائی کورٹ ۔ لاہور

انتساب

عاشو، بھائی اور حفصہ کے نام

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جَم نکلے

محبّت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اُٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ! اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتا ہوں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

مومنؔ

○

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے

تابِ نظّارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہو گی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومنؔ
آخری وقت کیا خاک مسلماں ہوں گے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ رُوٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم کو بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مُبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بہادر شاہ ظفر

○

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

چشمِ قاتل میری دشمن تھی ہمیشہ لیکن
جیسی اب ہو گئی قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی

اُن کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادُو
کہ طبیعت میری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

پلٹے کو یاں کوئی زنداں میں نیا ہے مجنوں
آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تُو نے
کیوں خرد مند بنایا؟ نہ بنایا ہوتا

○

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مُشتِ غبار ہوں

نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں

میرا رنگ رُوپ بگڑ گیا میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

پڑھے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع آ کے جلائے کیوں میں تو حسرتوں کا مزار ہوں

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

نشۂ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

داغؔ

○

رنج کی جب گفتگو ہونے لگی
آپ سے تم، تم سے تُو ہونے لگی

چاہیے پیغامبر دونوں طرف
لُطف کیا جب دو بدُو ہونے لگی

میری رسوائی کی نوبت آ گئی
اُن کی شہرت کُو بکُو ہونے لگی

نا اُمیدی بڑھ گئی ہے اِس قدر
آرزو کی آرزو ہونے لگی

اب کہ مل کر دیکھئے کیا رنگ ہو
پھر ہماری جستجو ہونے لگی

داغ اترائے ہوئے پھرتے ہیں آج
شاید ان کی آبرو ہونے لگی

○

اچھی صُورت پہ عجب ٹوٹ کے آنا دل کا
یاد آتا ہے ہمیں ہائے زمانہ دل کا

پوُری مہندی بھی لگانی نہیں آئی اب تک
کیونکر آیا تجھے غیروں سے لگانا دل کا

غنچۂ دل کو وہ مُٹھی میں لئے آتے ہیں
میں نے پوچھا تو کیا مجھ سے بہانہ دل کا

بعد مدّت کے اے داغؔ سمجھ میں آیا
وہی دانا ہے کہا جس نے نہ مانا دل کا

داغؔ کا نام سُن کے وہ بولے
ایسے اسّی ہزار پھرتے ہیں

تجھ کو اچھا کہا ہے کس کِس نے؟
کہنے والوں کو خیر کیا کہیے؟

امیرؔ مینائی

○

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

دیکھ لے بُلبُل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

آ گیا اس کا تصوّر تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی! یہ خیال اچھا ہے

حالؔی

○

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں

اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو، تو زباں میں اثر کہاں

حالیؔ نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح، رہے رات بھر کہاں

فانیؔ

○

اِک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا

خلق کہتی ہے جسے دل ترے دیوانے کا
ایک گوشہ ہے یہ دنیا، اسی ویرانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لاکے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

حُسن ہے ذات میری، عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع، مگر بھیس ہے پروانے کا

ہم نے چھانی ہیں بہت دیر و حرم کی گلیاں
کہیں پایا نہ ٹھکانا تیرے دیوانے کا
ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میّتِ فانیؔ
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

یاسؔ یگانہ

○

مجھے دل کی خطا پر یاسؔ شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

بُرا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا
کبھی گمراہ ہو کے راہ پہ آنا نہیں آتا

مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

دل بے حوصلہ ہے اِک ذرا سی ٹھیس کا مہماں
وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

آرزو

○

اوّل شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لَو جو لگائے شمع کھڑی رقص میں ہے پروانہ بھی

غُنچے چپ ہیں گُل ہیں ہوا پر کس سے کہیئے جی کا حال؟
خاک نشیں اک سبزہ ہے سو اپنا بھی بیگانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اٹھ کے چلا پروانہ بھی

دورِ مسرّت آرزو اپنا کیسا زلزلہ آگیں تھا
ہاتھ سے منہ تک آتے آتے ٹوٹ پڑا پیمانہ بھی

اکبرؔ الٰہ آبادی

○

ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے
ڈاکہ تو نہیں ڈالا چوری تو نہیں کی ہے

ناتجربہ کاری سے واعظ کی یہ باتیں ہیں
اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا
مہمانِ نظر اس دم اِک برقِ تجلّی ہے

واں دِل ہیں کہ صدمے دو یاں دل ہیں کہ سب سہہ لو
اُن کا بھی عجب دل ہے میرا بھی عجب جی ہے
سُورج میں لگے دھبّا فطرت کے کرشمے ہیں
بُت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے

حسرت موہانی

○

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

تجھ سے ملتے ہی وہ کچھ بے باک ہو جانا میرا
اور تیرا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ میرا پردے کا کونا دفعتہً
اور دوپٹے سے تیرا وہ منہ چھپانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

آ گیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکرِ فراق
وہ ترا رو رو کے بھی مجھ کو رُلانا یاد ہے

○

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گُل سے چمن تمام

حیرت غرورِ حُسن سے شوخی سے اضطراب
دل نے بھی تیرے سیکھ لئے ہیں چلن تمام

اللہ رے جسمِ یار کی خُوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

دیکھو تو حُسنِ یار کی جادُو نگاہیاں
بے ہوش اِک نظر میں ہوئی انجمن تمام

اقبالؔ

خدا کا فرمان (فرشتوں سے)

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے ہٹا دو

حق را بسجودِ صنم آں را بطواف
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجُھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوین کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

جوشؔ

شکستِ زنداں کا خواب

کیوں ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

دیوار کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جُنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے بے نُور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اِک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں

کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اِک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں

سنبھلو! کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

○

زندگی باگیسری ، سارنگ ، دیپک ، سوہنی
بُت تراشی ، رقص ، موسیقی ، خطابت، شاعری

زندگی یوسف زلیخا ، قیس ولیلیٰ ، نل دمن
عید کی مے ، چودھویں کی رات ، چوتھی کی دُلہن

تاثیر

منزل

آج میں دُور، بہت دُور، نکل آیا ہوں
بے طلب بے تگ و دو
دل میں کاوش، نہ تلاش
نہ کوئی خواہشِ مخفی، نہ تمنائے معاش
ہوسِ خام، نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آپہنچا ہوں
پے بہ پے، گام بہ گام
کس قدر دُور نکل آیا ہوں

اس سے پہلے بھی چلا ہوں میں نئی راہوں پر
شاہراہوں سے پرے
شہر و دیہات سے دُور
خارزاروں میں گھسٹتی ہوئی اک سُرخ لکیر
اِک سسکتی ہوئی دلدوز نفیر
سرسراتے ہوئے ملبوس

مہکتی ہوئی سانس
لذّت و کرب کا مدھم بم و زیر
آج لیکن میں بہت دُور نکل آیا ہوں
اور اِک شام سرِ راہگزار
وہ مری لغزشِ پا میری وہ بے راہ روی
خود فراموش، سبکدوشِ عمل
اپنے اجداد کے ناکردہ گناہوں کی عقوبت سے بری

اِک ہرن چوکڑی بھرتا ہوا خاموش خرام
شام کے وقت سرِ راہ گزار
میں بہت دُور بھٹک نکلا تھا
آج لیکن میں بہت دُور نکل آیا ہوں

آپ سے آپ بہت دُور بہت دُور نکل آیا ہوں
شاہراہوں سے پرے دُور گزرگاہوں سے
بے طلب بے تگ و دو
خانقاہوں سے الگ، دُور صنم خانوں سے
دل میں کاوش، نہ تلاش
نہ کوئی خواہشِ مخفی، نہ تمنائے معاش

ہوسِ خام نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا آ پہنچا ہوں
پے بہ پے، گام بہ گام
کس قدر دُور، بہت دور نکل آیا ہوں!

داورِ حشر میرا نامۂ اعمال نہ پوچھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

چراغ حسن حسرت

○

یا ربّ غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دُعا ہوتا

اِک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

اخترؔ شیرانی

○

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

اے عشق ہمیں برباد نہ کر، ہم بھُولوں ہوؤں کو یاد نہ کر
پہلے ہی بہت ناشاد ہیں ہم، تُو اور ہمیں ناشاد نہ کر
قسمت کا ستم ہی کم تو نہیں یہ تازہ ستم ایجاد نہ کر
یوں ظلم نہ کر بے داد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

جس دن سے ملے ہیں، دونوں کا سب چین گیا آرام گیا
چہروں سے بہار صبح گئی آنکھوں سے فروغ شام گیا
ہاتھوں سے خوشی کا جام چھُٹا، ہونٹوں سے ہنسی کا نام گیا
غمگیں نہ بنا ناشاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

وہ راز ہے یہ غم، آہ جسے پا جائے کوئی تو خیر نہیں
آنکھوں سے جب آنسو بہتے ہیں آ جائے کوئی تو خیر نہیں
ظالم ہے دنیا، دل کو یہاں بھا جائے کوئی تو خیر نہیں
ہے ظلم مگر فریاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

دنیا کا تماشا دیکھ لیا، غمگین سی ہے بے تاب سی ہے
امید یہاں اِک وہم سی ہے، تسکین یہاں اِک خواب سی ہے
دُنیا میں خوشی کا نام نہیں، دُنیا میں خوشی نایاب سی ہے
دُنیا میں خوشی کو یاد نہ کر
اے عشق ہمیں برباد نہ کر!

حفیظ جالندھری

ابھی تو میں جوان ہوں

ابھی تو میں جوان ہوں
ہوا بھی خوشگوار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے
ترنمِ ہزار ہے بہار پُر بہار ہے
کہاں چلا ہے ساقیا
اِدھر تو لوٹ اِدھر تو آ
ارے یہ دیکھتا ہے کیا
اُٹھا سبُو سُبو اُٹھا
سبُو اُٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے اِدھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر

وہ کالی کالی بدلیاں
اُفق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اِک ہجومِ میکشاں
ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیالِ زُہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں

(اقتباس)

عابد علی عابدؔ

○

چاند ستاروں سے کیا پُوچھوں کب دن میرے پھرتے ہیں
وہ تو بیچارے خود ہیں بھکاری ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

جن گلیوں میں ہم نے سکھ کی سیج پہ راتیں کاٹیں تھیں
ان گلیوں میں دیاکل ہو کر سانجھ سویرے پھرتے ہیں

رُوپ سُروپ کی جوت جگانا اس نگری میں جوکھم ہے
چاروں کھُونٹ بگولے بن کر گھور اندھیرے پھرتے ہیں

جن کے شیام بدن سائے میں میرا تن سستایا تھا
اب تک آنکھوں کے آگے وہ بال گھنیرے پھرتے ہیں

کوئی ہمیں بھی یہ سمجھا دو، ان پہ دل کیوں ریجھ گیا!
تیکھی چتون، بانکی چھب والے بہتیرے پھرتے ہیں

اس نگری کے باغ اور بن کی یاروں ہنسیلا نیاری ہے
پنچھی اپنے سر پر اٹھا کر اپنے بسیرے پھرتے ہیں

لوگ تو دامن سی لیتے ہیں، جیسے ہو جی لیتے ہیں
عابدؔ ہم دیوانے ہیں جو بال بکھیرے پھرتے ہیں

صُوفی تبسّم

○

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دُنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

اِک لحظہ بہے آنسو اِک لحظہ ہنسی آئی
سیکھے ہیں نئے دل نے اندازِ شکیبائی

جلووں کے تمنائی جلووں کو ترستے ہیں
تسکین کو روئیں گے جلووں کے تمنائی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبّت کے
آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی

یہ بزمِ محبّت ہے اِس بزمِ محبّت میں
دیوانے بھی شیدائی فرزانے بھی شیدائی

ہم اُن میں ماجرائے دردِ دل کہتے نہیں لیکن
بہ اندازِ حدیثِ دیگراں کہنا ہی پڑتا ہے

میراجی

○

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا، کیا اب تم سے بیان کریں
غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں

کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس نے کیں
کہتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں

بھلی بُری جیسی بھی گزری، ان کے سہارے گزری ہے
حضرتِ دل جب ہاتھ بڑھائیں ہر مشکل آسان کریں

ایک ٹھکانہ آگے آگے پیچھے پیچھے مسافر ہے
چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا اعلان کریں

مجبوروں کی مختاروں سے دُوری اچھی ہوتی ہے
مل بیٹھیں تو مبادا دونوں، باہم کچھ احسان کریں

شکیبؔ جلالی

○

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
گماں گزرتا ہے یہ شخص دوسرا ہے کوئی

بتا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

چھڑا کے ہاتھ بہت دور بہہ گیا ہے چاند
کسی کے ساتھ سمندر میں ڈوبتا ہے کوئی

مکان اور نہیں ہے بدل گیا ہے مکیں
افق وہی ہے مگر چاند دوسرا ہے کوئی

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی
شکیبؔ دیپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر
دیارِ چشم میں کیا آج رت جگا ہے کوئی

مری نظر میں تو خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
یہ برف سی ترے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی

ن۔م۔راشد

○

رقص

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے!
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو، نشاں پا لے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے!
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں

جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے!
زندگی میرے لئے
ایک خونی بھیڑیئے سے کم نہیں
اے حسین و اجنبی عورت! اسی کے ڈر سے میں
ہو رہا ہوں لمحہ لمحہ اور بھی تیرے قریب

جانتا ہوں تُو مری جاں بھی نہیں
تجھ سے ملنے کا پھر امکاں بھی نہیں
تو مری ان آرزوؤں کی مگر تمثیل ہے
جو رہیں مجھ سے گریزاں آج تک

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے!
عہدِ پیرانہ کا میں انساں نہیں
بندگی سے اس در و دیوار کی
ہو چکی ہیں خواہشیں بے سوز و رنگ و ناتواں

جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا تو ہوں
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت! مجھے اب تھام لے!

جگرؔ مُرادآبادی

دل میں کسی کی راہ کیے جا رہا ہوں میں
کِتنا حسیں گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند
خود حُسن کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

گُلشن پرست ہوں مجھے گُل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

یوں زندگی گزار رہا ہوں تیرے بغیر
جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں

مجھ سے ادا ہوا ہے جگرؔ جستجو کا حق
ہر ذرّے کو گواہ کیے جا رہا ہوں میں

فراق

○

شامِ غم کچھ اس نگاہِ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

یہ سکوتِ یاس یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکستِ ساز کی باتیں کرو

یہ رگِ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یوں ہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراقؔ
آج اس عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرو

ہم سے کیا ہو سکا محبّت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

ہمیں بھی دیکھ جو اس درد سے کچھ ہوش میں آئے
ارے دیوانہ ہو جانا محبّت میں تو آساں ہے

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

جذبیؔ

○

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے
یہ دُنیا ہو یا وہ دُنیا اب خواہشِ دُنیا کون کرے

جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنّا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

جو آگ لگائی تھی تم نے، اس کو تو بُجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے اِس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

دُنیا نے ہمیں چھوڑا جذبیؔ ہم چھوڑ نہ دیں کیوں دُنیا کو
دُنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں، اب دُنیا دُنیا کون کرے

مخدوم محیؔ الدین

○

آج کی رات نہ جا!

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے، دُور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئیگا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا سلام آئے گا
آج کی رات نہ جا!

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی، زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے، حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی، زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات نہ جا!

آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب کتنی مبارک ہے سحر
وقف ہے میرے لئے تیری محبّت کی نظر
آج کی رات نہ جا!

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

○

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشمِ نم مسکراتی رہی رات بھر

رات بھر درد کی شمع جلتی رہی
غم کی لَو تھرتھراتی رہی رات بھر

بانسری کی سُریلی سُہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر

یاد کے چاند دل میں اُترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر

کوئی دیوانہ گلیوں میں پھرتا رہا
کوئی آواز آتی رہی رات بھر

مجازؔ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے، کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ رُوپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون سمجھے کون جانے دل کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رُک کے دم لے لوں میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مِل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اِک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اِک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے وہ پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کے توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس کے اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اِس کا گلشن پھونک اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بہت مُشکل ہے دُنیا کا سنورنا
تری زُلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تُو اس آنچل کا اِک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ابنِ انشاء

○

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا تیرا

ہم بھی وہیں موجود تھے ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیئے ہم چپ رہے منظور تھا پردہ تیرا

اس شہر میں کس سے ملیں ہم سے تو چھوٹیں محفلیں
ہر شخص تیرا نام لے ، ہر شخص دیوانہ تیرا

تو باوفا ، تو مہرباں ، ہم اور تجھ سے بدگماں ؟
ہم نے تو پوچھا تھا ذرا یہ وصف کیوں ٹھہرا تیرا

کوچے کو تیرے چھوڑ کر جوگی ہی بن جائیں مگر
جنگل تیرے ، پربت تیرے ، بستی تیری ، صحرا تیرا

ہم اور رسمِ بندگی ! آشفتگی ، اُفتادگی

احسان ہے کیا کیا تیرا اے حسنِ بے پروا تیرا
ہم پہ یہ سختی کی نظر؟ ہم ہیں فقیر راہگزر
رستہ کبھی روکا تیرا دامن کبھی تھاما تیرا

ہاں ہاں تیری صورت حسیں لیکن تُو اتنا بھی نہیں
اس شخص کے اشعار سے شہرہ ہوا کیا کیا تیرا

بے درد سنی ہو تو چل کہتا ہے کیا اچھی غزل
عاشق تیرا، رُسوا تیرا، شاعر تیرا، انشاء تیرا

انشا جی اُٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں دل کو لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا

اس دل کے دریدہ دامن میں دیکھو تو سہی سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا

شب بیتی چاند بھی ڈوب چلا زنجیر پڑی دروازے پہ
کیوں دیر گئے گھر آئے ہو سجنی سے کرو گے بہانہ کیا

جب گھر کے لوگ نہ رہنے دیں کیوں بَن میں نہ بسرام کریں
دیوانوں کی سی نہ بات کرے تو اور کرے دیوانہ کیا

سُن تو لیا کسی نار کی خاطر کاٹا کوہ، نکالی نہر
ایک ذرا سے قصّے کو اب دیتے کیوں ہو طُول میاں

اب جو ہونے تھے قصّے سبھی ہو چکے تم ہمیں کھو چکے ہم تمہیں کھو چکے
آگے دل کی نہ باتوں میں آنا سجن کہ یہ دل ہے سدا کا دوانا سجن

مجروؔح سلطانپوری

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اس کوئے تشنگی میں بہت ہے، کہ ایک جام
ہاتھ آگیا ہے دولتِ بیدار کی طرح

وہ تو کہیں ہیں اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شئے نگہِ یار کی طرح

سیدھی ہے راہِ شوق پہ یونہی کہیں کہیں
خم ہو گئی ہے گیسوئے دلدار کی طرح

اب جا کے کچھ کھُلا ہنرِ ناخنِ جنوں
زخمِ جگر ہوئے لب و رُخسار کی طرح

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہلِ وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

جاں نثار اختر

○

تجزیہ

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن !
پھر جب پاس تو نہیں ہوتی
خود کو اتنا اداس پاتا ہوں
گُم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دُھن سمائی رہتی ہے
اک خموشی سی چھائی رہتی ہے
دِل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن !

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!
پھر بھی شب کی طویل خلوت میں
تیرے اوقات سوچتا ہوں میں
تیری ہر بات سوچتا ہوں میں
کون سے پھول تجھ کو بھاتے ہیں
رنگ کیا کیا پسند آتے ہیں
کھو سا جاتا ہوں تیری جنّت میں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!
پھر بھی احساس سے نجات نہیں
سوچتا ہوں تو رنج ہوتا ہے
دل کو جیسے کوئی ڈبوتا ہے
جس کو اتنا سراہتا ہوں میں
اس میں تیری سی کوئی بات نہیں
میں تجھے چاہتا نہیں لیکن!

ایک لمحہ

مدّت سے کسی کی آنکھوں سے اِک لمحے کو آنکھیں چار ہوئیں
کچھ سانس کسی کی رُک سی گئی کچھ روح میری تھرّا سی گئی
کچھ پچھلی وفائیں یاد آئیں کچھ عہد کبھی کے یاد آئے
کچھ میری نگاہیں جھک سی گئیں کچھ ان کی نظر شرما سی گئی

ظہیر کاشمیری

○

لوحِ مزار دیکھ کے جی دنگ رہ گیا
ہر ایک سر کے ساتھ فقط سنگ رہ گیا

بدنام ہو کے عشق میں ہم سرخرو ہوئے
اچھا ہوا کہ نام گیا ننگ رہ گیا

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلط
خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا

اپنے گلے میں اپنی ہی باہوں کو ڈالیئے
جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے
آج اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا

کُل کائنات فکر سے آزاد ہو گئی
انساں مثالِ دستِ تہہ سنگ رہ گیا
ہم اُن کی بزمِ ناز میں یوں چُپ ہوئے ظہیرؔ
جس طرح گھُٹ کے ساز میں آہنگ رہ گیا

عبدالحمید عدمؔ

○

جو لوگ جان بوجھ کر نادان بن گئے
میرا خیال ہے کہ وہ انسان بن گئے

ہم حشر میں گئے تھے مگر کچھ نہ پوچھیے
وہ جان بوجھ کر وہاں انجان بن گئے

ہنستے ہیں ہم کو دیکھ کے اربابِ آگہی
ہم آپ کے مزاج کی پہچان بن گئے

منجدھار تک پہنچنا تو ہمت کی بات ہے
ساحل کے آس پاس ہی طوفان بن گئے

انسانیت کی بات تو اتنی ہے شیخ جی
بدقسمتی سے آپ بھی انسان بن گئے

کانٹے بہت تھے دامنِ فطرت میں اے عدمؔ
کچھ پھول اور کچھ مرے ارمان بن گئے

میں میکدے کی راہ سے بچ کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کافی طویل تھا

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

فیض احمد فیضؔ

○

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو سنورنے لگتے ہیں

در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

پا پوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

دونوں جہان تیری محبّت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مُسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پُوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

○

ہم خستہ تنوں سے محتسبو! کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مُشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

مجید امجد

○

برس گیا بہ خراباتِ آرزو تیرا غم
قدح قدح تیری یادیں سبو سبو تیرا غم

تیرے خیال کے پہلو سے اُٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں چار سُو تیرا غم

غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تیری دُھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبِ جُو تیرا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر، سیاہیٔ شب
تیری طلب تجھے پانے کی آرزو تیرا غم

نگہ اُٹھی تو زمانے کے سامنے تیرا رُوپ
پلک جُھکی تو میرے دل کے رو بُرو تیرا غم

میں روز اِدھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں آج اِدھر سے نہیں گزروں گا کون دیکھے گا

ناصؔر کاظمی

○

گئے دنوں کا سُراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گُل تھا کہ نغمۂ جاں میرے تو دل میں اُتر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہلِ دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تُو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصؔر
تیری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

○

کچھ یادگارِ شہرِ ستمگر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
مِلا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دِکھا گیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دُشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لُطف بھی چلا گیا

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صُحبتیں
زمیں نِگل گئی انہیں یا آسمان کھا گیا

جو اور کچھ نہیں تو کوئی تازہ درد ہی ملے
میں ایک ہی طرح کی زندگی سے تنگ آ گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آ گیا

حفیظ ہوشیارپوری

○

محبّت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

زمانے بھر کے غم یا اِک ترا غم
یہ غم ہو گا تو کتنے غم نہ ہوں گے

اگر تو اتفاقاً مِل بھی جائے
تیری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے

دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

حفیظؔ ان سے میں جتنا بدگماں ہوں
وہ مجھ سے اس قدر برہم نہ ہوں گے

کیفی اعظمی

میں یہ سوچ کر اس کے در سے چلا تھا
کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو

ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن
کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو

قدم ایسے انداز سے اُٹھ رہے تھے
کہ آواز دے کے بُلا لے گی مجھ کو

مگر اس نے روکا نہ مجھ کو منایا
نہ آواز ہی دی نہ واپس بُلایا

میں آہستہ آہستہ چلتا ہی آیا
یہاں تک کہ اس سے جُدا ہو گیا میں

کوئی یہ کیسے بتائے کہ وہ تنہا کیوں ہے
وہ جو اپنا تھا وہی آج کسی کا کیوں ہے
یہی دنیا ہے جو آخر تو یہ دُنیا کیوں ہے
یہی ہوتا ہے تو آخر یہی ہوتا کیوں ہے

اِک ذرا ہاتھ بڑھا دیں تو پکڑ لوں دامن
اس کے سینے میں سما جائے ہماری دھڑکن
اتنی قربت ہے تو پھر فاصلہ اتنا کیوں ہے

دل برباد سے نکلا نہیں اب تک کوئی
اس لٹے گھر پہ دیا کرتا ہے دستک کوئی
آس جو ٹوٹ گئی پھر سے بندھاتا کیوں ہے
تم مسرّت کا کہو یا اسے غم کا رشتہ
کہتے ہیں پیار کا رشتہ ہے جنم کا رشتہ
ہے جنم کا جو یہ رشتہ تو بدلتا کیوں ہے

علی سردار جعفری

تم نہیں آئے تھے

تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو موجود تھے تم
آنکھ میں نُور کی اور دل میں لہو کی صورت
درد کی لَو کی طرح پیار کی خوشبو کی طرح
بے وفا وعدوں کی دلداری کا انداز لئے
تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو تم آئے تھے
رات کے سینے میں مہتاب کے خنجر کی طرح
صبح کے ہاتھ میں خورشید کے ساغر کی طرح
شاخِ خونِ رنگِ تمنا میں گُلِ تر کی طرح

تم نہیں آؤ گے جب تب بھی تو تم آؤ گے
یاد کی طرح دھڑکتے ہوئے دل کی صورت
غم کے پیمانۂ سرشار کو چھلکاتے ہوئے
برگ ہائے لب و رُخسار کو مہکاتے ہوئے
دل کے بجُھتے ہوئے انگارہ کو دہکاتے ہوئے
زُلف در زُلف بکھر جائے گا پھر رات کا رنگ
شبِ تنہائی میں بھی لطفِ ملاقات کا رنگ

آؤ آنے کی کریں بات کہ تم آئے ہو
اب تم آئے ہو تو میں کون سی شے نذر کروں

کہ مرے پاس بجُز مہر و وفا کچھ بھی نہیں
ایک دل ایک تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں

سیف الدین سیفؔ

جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

کِس طرح روکتا ہوں اشکوں کو
کِس طرح دل پہ جبر کرتا ہوں
آج بھی کارزارِ ہستی میں !
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

حالِ دل بھی نہ کہہ سکا گرچہ
تُو رہی مدتوں قریب مرے
کچھ تری عظمتوں کا ڈر بھی تھا
کچھ خیالات تھے عجیب مرے
آخرِ کار وہ گھڑی آئی،
بار ور ہو گئے رقیب مرے
تُو مجھے چھوڑ کر چلی بھی گئی
خیر قسمت مری، نصیب مرے
اب میں کیوں تجھ کو پیار کرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

گو زمانہ تری محبّت کا
ایک بھُولی ہوئی کہانی ہے
تیرے کُوچے میں عمر بھر نہ گئے
ساری دنیا کی خاک چھانی ہے
لذّتِ قُرب ہو کہ زخمِ فراق
جو بھی ہے تیری مہربانی ہے
کس تمنّا سے تجھ کو چاہا تھا
کس محبّت سے ہار مانی ہے
اپنی قسمت پہ ناز کرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

کوئی پُرسانِ حال ہو تو کہوں
کیسی آندھی چلی ہے تیرے بعد
دن گزارا ہے کس طرح میں نے
رات کیسے ڈھلی ہے تیرے بعد
شمعِ اُمید صرصرِ غم میں
کس بہانے جلی ہے تیرے بعد
جس میں کوئی مکیں نہ رہتا ہو
دل وہ سُونی گلی ہے تیرے بعد
روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں
جب ترے شہر سے گزرتا ہوں

(اقتباس)

احمد ندیم قاسمی

○

سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے دیکھوں تو مجھے
دشت آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے خفا لگتا ہے

مُسکراتا ہے جو اس عالم میں
بخُدا مجھ کو خُدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

○

اُس کے اندر کوئی فنکار چھُپا بیٹھا ہے
جانتے بُوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

○

گُل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہوں بھری برسات کی بوچھاڑوں میں

مجھ سے کترا کے نکل جا مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رُخساروں میں

حُسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غُنچے کھِلتے ہیں تو بِک جاتے ہیں بازاروں میں

زخم چھُپ سکتے ہیں لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی شامل مِرے شاہکاروں میں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اُٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کُہساروں میں
مجھ کو نفرت سے نہیں پیار سے مصلوب کرو
میں تو شامل ہوں محبّت کے گنہگاروں میں

ساحر لدھیانوی

○

ہوس نصیبِ نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے بادِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبّت کے گیت اے مُطرب!
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں تو مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کِس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

پھر نہ کیجے مِری گستاخ نگاہی کا گِلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ زندگی تیری زُلفوں کی نرم چھاؤں میں
گذرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تیری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم رہ کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہیں حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھ کو جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں، ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی راہگزروں سے
مہیب سائے مری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُر ہول خارزاروں میں

نہ کوئی جادہ نہ منزل نہ روشنی کا سُراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
اِنہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

مصطفےٰ زیدی

○

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غمِ دل مرے رفیقو! غمِ رائیگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی رازداں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہرباں نہیں ہے

مری رُوح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسّم مرا ترجماں نہیں ہے

کسی زُلف کو صدا دو کسی آنکھ کو پُکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

غم اگر کرو تو اس کا کہ سماج ابھی وہی ہے
ارے یہ بھی کوئی غم ہے کہ نہ مِل سکیں گے ہم تم

○

بچا گئیں کئی لوگوں کو متحد لہریں
ڈبو دیا ہمیں پا یابیٔ تمنّا نے
میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

○

کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا
دیکھا تو ہر جمال اسی آئینے میں تھا

اک موجِ خونِ خلق تھی کس کی جبیں پہ تھی
اک طوقِ فردِ جرم تھا کس کے گلے میں تھا

صہبائے تند و تیز کی حدّت کو کیا خبر
شیشے سے پوچھئے جو مزا ٹوٹنے میں تھا

کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سلسلے
وہ کم سخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

تائب تھے احتساب سے جب سارے بادہ کش
مجھ کو یہ افتخار کہ میں میکدے میں تھا

گلہ نہیں ہے کسی سے مجھے کہ محرومی
تمہارے در سے نہ ملتی تو گھر سے مل جاتی

دُنیا کی بے اصُول عداوت تو دیکھئے
ہم بوالہوس بنے تو وفا عام ہو گئی

شکیلؔ بدایونی

○

غمِ عاشقی سے کہہ دو رہِ عام تک نہ پہنچے
مجھے خوف ہے یہ تہمت مرے نام تک نہ پہنچے

میں نظر سے پی رہا تھا کہ یہ دل نے بددُعا دی
ترا ہاتھ زندگی بھر کبھی جام تک نہ پہنچے

نئی صُبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے

یہ ادائے بے نیازی تجھے بے وفا مُبارک
مگر ایسی بے رُخی کیا کہ سلام تک نہ پہنچے

جو نقابِ رُخ اُٹھا دی تو یہ قید بھی لگا دی
اُٹھے ہر نگاہ لیکن کوئی بام تک نہ پہنچے

حمایت علی شاعر

○

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لئے کیجئے کسی گم گشتہ جنّت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی سُن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

شمع کی مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعران کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر سُنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

خاطر غزنوی

○

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدّر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

اب بھی ان یادوں کی خوشبو ذہن میں محفوظ ہے
بارہا ہم جن سے گلزاروں کو مہکانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

شہریار

⃝

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حِس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تا حدِّ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیماں، پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آئی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

حبیب جالبؔ

○

اِس شہرِ خرابی میں غمِ عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے

یہ ہنستا ہوا چاند یہ پُر نور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذرّوں کے سہارے

حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پُکارے

ہر صُبح مری صُبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے

کچھ اور بھی ہے کام ہمیں اے غمِ جاناں
کب تک کوئی اُلجھی ہوئی زُلفوں کو سنوارے

کہتے مجھے وہ اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

کچھ اور ہو گیا ہے وہ شاعر نہیں رہا
وابستہ ہو گیا جو کسی تاجدار سے

قتیلؔ شفائی

○

یارو کسی قاتل سے کبھی پیار نہ مانگو
اپنے ہی گلے کے لئے تلوار نہ مانگو

گر جاؤ گے تم اپنے مسیحا کی نظر سے
مر کر بھی علاجِ دلِ بیمار نہ مانگو

سچ بات پہ ملتا ہے سدا زہر کا پیالہ
جینا ہے تو پھر جراٴتِ اظہار نہ مانگو

کھل جائے گا اس طرح نگاہوں کا بھرم بھی
کانٹوں سے کبھی پھول کی مہکار نہ مانگو

اس چیز کا کیا ذکر جو ممکن ہی نہیں ہے
صحرا میں کبھی سایۂ دیوار نہ مانگو

یہ معجزہ بھی محبّت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ اس پر گرے اور زخم آئے مجھے

سکندر سہراب

جلتے ہونٹ مچلتی زُلفیں آج کی شب عنوان رہے
آج کی شب اے جانِ تمنا مجھ پر یہ احسان رہے

باتوں میں من موہنے والے پار نہ اُترے یار کبھی
کون ہے اپنا کون پرایا اتنی تو پہچان رہے

سب سے ہنس کر ملنا تیری عادت بھی ہو سکتی ہے
تیری ایک ہنسی پر بھُولے ہم کتنے نادان رہے

مجھ کو دنیا پاگل جانے یا دیوانہ سمجھیں لوگ
طعنے دیں یا پتھر ماریں اب تو پیار کا مان رہے

پیار کا دھوکا دینے والے نفرت ہی سے دیکھ مجھے
جینا دُوبھر کرنے والے مرنا تو آسان رہے

سپنوں میں بھی کب آتے ہو، ملنا بھی اب خواب ہوا
تم کو اپنا کر لینے کے کل کتنے ارمان رہے
دولت، شہرت، عزت سب اِک پہچان کی خاطر دی
دل بھی ہارا، جان بھی واری پھر بھی وہ انجان رہے
شہر میں چاروں کونٹ پھرے وہ ممکن ہے سہرآب کبھی
میرے گھر بھی آئے کسی دن میرا بھی مہمان رہے

وہ دورِ فسوں داغ ہے تاریخِ جنوں پر
جس دور کا منصور سرِ دار نہیں تھا

دل وہ امید کی سوکھی ہوئی کھیتی ہے جسے
بدلیاں دُور سے ترسا کے گزر جاتی ہیں

آگ بھڑکے تو ملے مرگِ مسلسل سے نجات
بجلیاں پاس سے لہرا کے گزر جاتی ہیں

ہر نقشِ پا سے ان کی اُبھرتی ہیں منزلیں
گم ہو کے رہ گئے جو محبّت کی راہ میں

امیدوں پر جینے والے سچ ہی جانیں جھوٹ کو بھی
جانے کیا ہو تیرا وعدہ قسمت سے سچ نکلے تو
اب کہ آنچ حوادث کی کچھ اتنی تیز اور بےانداز
کُندن بن کر نکلیں گے اس بار اگر بچ نکلے تو

اِفتخار عارف

○

ہونے کو تو کیا ہُوا نہیں ہے
ہم نے کبھی کہا نہیں ہے

سب اپنے جنوں کی وحشتیں ہیں
تجھ سے تو کوئی گِلہ نہیں ہے

بکھروں تو کوئی سمیٹ لے گا
اِس کا بھی تو آسرا نہیں ہے

کیا زیست کریں اب تو حبیبا
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

ویرانۂ دشتِ جاں میں کوسوں
سائے کا کہیں پتہ نہیں ہے

اُلجھا ہوں کچھ ایسے پیچ وخم میں
منزل تو ہے راستہ نہیں ہے

○

دیارِ نُور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

میں اس سے جھوٹ بھی بولوں وہ مجھ سے سچ بولے
مرے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی میری رسوائیوں کا ساتھی ہو

میں اس کے ہاتھ نہ آؤں وہ میرے ساتھ رہے
میرے سُرور، مری محفلوں کا ساتھی ہو

وہ خواب دیکھے تو دیکھے مرے حوالے سے
میرے خیال کے سب منظروں کا ساتھی ہو

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

مُنیر نیازی

○

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد
اور مجھے اس ملک میں کمزور تر اس نے کیا

راہبر میرا بنا گمراہ کرنے کے لئے
مجھ کو سیدھے راستے سے دربدر اس نے کیا

شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہوا
پھر مجھے اس شہر میں نامعتبر اس نے کیا

شہر کو برباد کر کے رکھ دیا اس نے منیرؔ
شہر پر یہ ظلم میرے نام سے اس نے کیا

منیرؔ اس شہر پہ آسیب کا سایہ ہے کہ کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

امجد اسلام امجد

گُلاب چہرے پر مُسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالج کی سیڑھیوں سے
سہیلیوں کو لئے اُترتی

تو ایسا لگتا کہ جیسے دل میں اُتر رہی ہو
کچھ اس تیقّن سے بات کرتی
کہ جیسے دنیا اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہو
وہ اپنے رستے پہ دل بچھاتی
ہوئی نگاہوں سے ہنس کے کہتی
تمہارے جیسے بہت سے لڑکوں سے میں یہ باتیں
بہت سے برسوں سے سن رہی ہوں
میں ساحلوں کی ہواؤں نیلے سمندروں کے لئے بنی ہوں
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
جو راہ چلتی تو ایسا لگتا کہ جیسے دل میں اُتر رہی ہو
وہ کل ملی تھی اسی طرح تھی
گلاب چہرے پہ مسکراہٹ

چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہو
مگر جو بولی تو اس کے لہجے میں وہ تھکن تھی
کہ جیسے صدیوں سے دشتِ ظلمت میں چل رہی ہو

شاہد محمود شاہد

○

خواب سارے عذاب ہونے لگے
لوگ کیا تھے کہ خواب ہونے لگے

کتنے گل رنگ لمحے پاس آئے
کیسے پل پل گلاب ہونے لگے

پھر وصال و فراق کی باتیں
زخم پھر بے حجاب ہونے لگے

ہم سے چھوٹیں وہ پیار کی گلیاں
ہم کہاں کامیاب ہونے لگے

پھر ہوا مصلحت کی چل نکلی
پھر دیئے آفتاب ہونے لگے

زیست کرنے چلے تھے پیار کے ساتھ
رنج تب بے حساب ہونے لگے

خونِ دل وحشتِ جاں صلۂ اُلفت ٹھہرا
حاصلِ رنگِ حنا بادۂ فرقت ٹھہرا

رات پھر دیدۂ غم عکسِ رُخِ جاناں بنا
سر میں سودا تیرا غمخانۂ تہمت ٹھہرا

ایسی بے بس تو کبھی تھی نہ جنوں کی دُنیا
وہ جو دیوانہ ہوا نقشِ ہزیمت ٹھہرا

پائے کوباں ہے کوئی وقفِ سلاسل کوئی
کچھ نہ ٹھہرا جو نظر میں تیرا قامت ٹھہرا

میں تو انکارِ جفا دیکھ پشیمان ہوا
ایسا منظرِ دل اکس درجہ قیامت ٹھہرا

جیسے صیاد نہ تھا بخششِ جاں کرتا تھا
یوں مجھے کافرِ جاں دالئ قسمت ٹھہرا
شاہدؔ اب دردِ محبّت ہے عیشِ جاں کا زیاں
تُو ہے سادہ وہ حسیں واقفِ اُلفت ٹھہرا

پُرانے خواب نئی وحشتیں جگانے لگے
کہ دوست تھے جو عدو بن کے یاد آنے لگے

مجھے تمہارے بچھڑنے کا غم ہی کیا کم تھا
جو اب خیال سے سب نقش بھی چُرانے لگے

دل و نظر میں سمائی ہیں رنجشیں ایسی
تمام پیار کے منظر بھی جی جلانے لگے

قفس میں چاند تھا، تارے تھے، آتشِ گُل بھی
یہ خواب کیسے مجھے گلستاں دکھانے لگے

دل و دماغ سے الفت کی نسبتیں نہ مٹیں
وفا کے نام پر ظالم نہ حرف آنے لگے

دیارِ عشق سے لوٹے ہیں بے مرام زبس
جبیں پہ زخم دلوں میں ہیں تازیانے لگے

ہر ایک عہد میں جلتے ہیں چاک پیراہن
ہر ایک عہد کو آشفتہ سر منانے لگے

کہو فراق کی راتوں میں کیسا حال رہا
کہو کہ پیار کے نخچیر کیوں ٹھکانے لگے

پروین شاکر

سبھی گناہ دُھل گئے جزا ہی اور ہو گئی
میرے وجود پر تیری گواہی اور ہو گئی

رفوگرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر
ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہو گئی

بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گل کھِلے کہ شوخیٔ صبا ہی اور ہو گئی

یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھُل رہی تھیں یا کہ پھر
شگن کی رات سرخیٔ حنا ہی اور ہو گئی

اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ ساز گار تھا
چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہو گئی
نجانے دشمنوں کی کون بات یاد آ گئی
لبوں تک آتے آتے بد دُعا ہی اور ہو گئی

خوشبو کہیں نہ جائے یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زُلف کھولیئے

عبیداللہ علیم

○

خیال و خواب ہوئی ہیں محبّتیں کیسی
لہو میں ناچ رہی ہیں وحشتیں کیسی

نہ شب کو چاند ہی اچھا نہ دن کو مہر اچھا
یہ ہم پہ بیت رہی ہیں قیامتیں کیسی

وہ ساتھ تھا تو خدا بھی تھا مہرباں کیا کیا
بچھڑ گیا تو ہوئی ہیں عداوتیں کیسی

عذاب جن کا تبسّم ثواب جن کی نگاہ
کھنچی ہوئی ہیں پسِ جاں یہ صورتیں کیسی

ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ ہیں ہم
جو بجھ گئے تو ہوا سے شکایتیں کیسی

جو بے خبر کوئی گزرا تو یہ صدا دی ہے
میں سنگِ راہ ہوں مجھ پر عنایتیں کیسی

نہیں کہ حُسن ہی نیرنگیوں میں طاق نہیں
جنوں بھی کھیل رہا ہے سیاستیں کیسی

یہ دورِ بے ہنراں ہے، بچا رکھو خود کو
یہاں صداقتیں کیسی، کرامتیں کیسی

○

تیرے پیار میں رسوا ہو کر جائیں کہاں دیوانے لوگ
جانے کیا کیا پوچھ رہے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

ہر لمحہ احساس کی صہبا رُوح میں ڈھلتی جاتی ہے
زیست کا نشہ کچھ کم ہو تو ہو آئیں میخانے لوگ

جیسے تمہیں ہم نے چاہا ہے کون بھلا یوں چاہے گا
مانا اور بہت آئیں گے تم سے پیار جتانے لوگ

یوں گلیوں بازاروں میں آوارہ پھرتے رہتے ہیں
جیسے اس دنیا میں سبھی آئے ہوں عمر گنوانے لوگ

کیسے دکھوں کے موسم آئے کیسی آگ لگی یارو!
اب صحراؤں سے لاتے ہیں پھولوں کے نذرانے لوگ

کل ماتم بے قیمت ہوگا آج ان کی توقیر کرو
دیکھو خونِ جگر سے کیا کیا لکھتے ہیں افسانے لوگ

ندیم خان

تنہائیوں کا زہر مجھے کاٹتا رہا
ہوں اتنا سخت جان میں پھر بھی نہ مر سکا

سانسوں سے بھی قریب تجھے میں نے پا لیا
اپنی تلاش کے لئے پھر عمر بھر پھرا

آنگن میں چار سُو تیری خوشبو بکھر گئی
پھر یاد کا دریچہ یہ کس سمت کھل گیا

تجھ سے ملے تو آنکھ میں آنسو بھی آ گئے
خوشبو کے ایک پل میں زمانے کا بوجھ تھا

پھر آج چاندنی تھی صلیبوں پہ لخت لخت
پھر آج چاند شاخ میں اٹکا ہوا ملا

مجھ سے نہ کر ندیمؔ تُو سود و زیاں کی بات
مجھ کو تو خیر درد ملا تجھ کو کیا ملا

آشنا کیا کیا بنے اِک دو ملاقاتوں کے بعد
"ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد"

اُس سے میں پُوچھوں گا یارو گر ملا اس سے کبھی
کیا مِلا تجھ کو بتا اتنی مناجاتوں کے بعد

کیا خبر تھی مجھ کو یا دل اتنا بے پرواہ بھی ہے
سخت تنہا کر گیا ہے اب کی برساتوں کے بعد
وہ گھڑی چاہت کے بدلے درد کے ساگر ملے
کتنی جاں لیوا سحر تھی چاندنی راتوں کے بعد
بیخودی میں بڑھ رہا تھا یہ بتی منزل کی طرف
کون مجھ سے پیار کرتا میری ان باتوں کے بعد

ساغر صدیقی

○

میں تلخیٔ حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا

اتنی دقیق شے کوئی کیسے سمجھ سکے
یزداں کے واقعات سے گھبرا کے پی گیا

چھلکے ہوئے تھے جام پریشاں تھی زلفِ یار
کچھ ایسے حادثات سے گھبرا کے پی گیا

دنیائے حادثات ہے اِک دردناک گیت
دنیائے حادثات سے گھبرا کے پی گیا

کانٹے تو خیر کانٹے ہیں ان سے گلہ ہی کیا
پھولوں کی واردات سے گھبرا کے پی گیا

ساغر وہ کہہ رہے تھے کہ پی لیجئے حضور
اُن کی گذارشات سے گھبرا کے پی گیا

احمد فراز

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

تو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسّس بیکار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ میری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے

آج اِک اور برس بیت گیا اُس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فراز
جُز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

فغاں کہ اہلِ ہوس بھی(۱) سجائے پھرتے ہیں
دلوں میں داغ جبیں پر لہو ہماری طرح

گرفتہ دل عندلیب گھائل گلاب دیکھے
محبتوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے

وہ دن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پہ ہوں
یہ شہر اک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے

عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ میں نے دہلیزِ قاتلاں پر گلاب دیکھے

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو آنکھوں میں آبلے ہیں
اور آبلوں سے کہاں تلک کوئی خواب دیکھے

یہ صبحِ کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

فرازؔ ہم مکتبی کے دن یاد آ گئے ہیں
میں اس کو پڑھتا تھا اور وہ کتاب دیکھے

ہم محبّت میں بھی توحید کے قائل فرازؔ
ایک ہی شخص کو محبوب بنایا ہم نے

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لئے
اب یہی ترکِ تعلق کے بہانے مانگے

زندگی ہم تیرے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فرازؔ
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

حکایاتِ خونچکاں

فیض احمد فیضؔ ، ایلس فیض ، علی سردار جعفری

کے انمول مضامین ، غزلیں اور نظمیں ،

ناشر

دستک پبلیکیشنز لاہور